جناب سید امتیاز علی تاج

جدید سوانح نگاری

سوانح عمریاں بہت پرانے زمانے سے لکھی جا رہی ہیں۔ پلوٹارک کی مشاہیر یونان و روما سے کون واقف نہ ہوگا لیکن بہ حیثیت ادب کے سوانح نگاری نے مغرب میں جو جدید صورت پچھلے پچیس تیس سال میں اختیار کی ہے، اس کے باعث ادب کے طالب علموں کو اس سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو چکی ہے۔

یوں پچھلے پچیس تیس سال سے نئی شاعری اور نئے ناول کا چرچا بھی بہت ہے لیکن ان کے متعلق اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ادب کی ان قدیم اصناف نے جدید صورتیں اختیار کر لی ہیں ورنہ بطور اصناف ادب کے ان کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑنے پایا۔ لیکن سوانح نگاری کی بات اور ہے۔ اسے پچھلے پچیس تیس سال میں یہ مرتبہ پہلی بار حاصل ہوا ہے کہ ادب کی ایک مستقل صنعت قرار دے لیا گیا ہے۔

ہر فن میں مقدم ترین بات یہ ہوتی ہے کہ فن کار کی تخلیقی قوتوں کا مظہر ہو ادیب لکھتا ہے کہ اپنے کسی ذاتی تصور کا اظہار کرے۔ لکھنے کے لیے موضوع کوئی ایسا منتخب کرتا ہے جو اس کی مخصوص قابلیت کو بہترین طور سے نظارہ افروز کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ پرانی سوانح نگاری میں اس کا امکان نہ تھا، اس کا مقصد فن کارانہ نہ تھا، افادی تھا۔ سوانح نگار پڑھنے والوں کو صرف معلومات بخشتا تھا۔ اچھا سوانح نگار زیادہ تحقیق سے کام لیتا۔ اگر اتفاق سے ادیب ہوتا تو اس کی تصنیف کے طرز تحریر میں ادب کی چاشنی آ جاتی تھی۔ ادیب نہ ہوتا جب بھی اس کی تصنیف اپنا اصلی مقصد پورا کرنے میں ناکام نہ رہتی تھی۔ فن کارانہ تاثر پیدا نہ ہوتا تو صحیح واقعات کا اظہار تو ہو ہی جاتا تھا۔

اُردو میں زیادہ سوانح عمریاں اسی نوع کی ہیں جس کی سوانح عمری لکھی جاتی ہے۔ اس کی

جائے پیدائش، تاریخ پیدائش، والدین، تعلیم و تربیت وغیرہ، تمام اہم امور کے متعلق زیادہ سے زیادہ اور صحیح معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لکھنے والے حالی اور آزاد جیسے سوانح نگار ہوں تو اُن کی تحریروں میں ادبی لطافت بھی ملتی ہے لیکن ان کی غرض ادبی لطافت پیدا کرنا نہ تھا۔ یہ اس لیے پیدا ہوئی کہ حالی اتفاق سے ادیب بھی واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کی کوئی تحریر ادبی لطافت سے خالی نہ رہ سکتی تھی۔ ورنہ سوانح عمری لکھنے سے اصلی غرض ان کی یہی تھی کہ واقعات بیان کیے جائیں۔ اسی طرح شبلی کو واقعات بیان کرتے کرتے تامل نہیں ہوتا تھا کہ رک کر اپنے مواد کی صحت پر بحث شروع کر دیں، اپنے بیان کے ثبوت میں مختلف حوالے لائیں اور موزوں و اہم اقتباسات سے اپنے دلائل کو تقویت بخشیں۔ ان کے نزدیک مقدم تاریخ رہی، ادب کو انھوں نے ثانوی مقام دیا۔

لیکن موجودہ زمانے کا امتیازی سوانح نگار مقدم ادب کو سمجھتا ہے۔ وہ کسی کی سوانح عمری اس خیال سے نہیں لکھتا کہ اس کے متعلق معلومات بہم پہنچائے بلکہ صرف اس لیے کہ اس کی زندگی کو فن کارانہ اظہار کے لیے وہ بہ حیثیت موضوع کے اعلیٰ و پسندیدہ سمجھتا ہے۔ اس کی تصنیف کے ڈھب ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی غرض ایک فن کارانہ تصویر پیدا کرنا ہے۔ وہ شبلی کی طرح واقعات کو حوالے اور ثبوت اور اقتباس درج کر کے پیش نہیں کرتا۔ بلکہ انھیں جیسے افسانے کی لڑی میں پرو لیتا اور ایسے نظم و تناسب سے مرتب کرتا ہے کہ جو تصویر آنکھوں کے سامنے لانا مقصود ہو، وہ امکان بھر جیتی جاگتی اور تفریح بخش بن جاتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی نہیں کرتا کہ نرا مؤرخ بن کر لکھنے میں غیر جانب داری سے کام لے۔ اس کا تمام بیان اپنے انفرادی تصور کے رنگ سے رنگین اور تفریح بخش معلوم ہوتا ہے۔ اسے شخصیت کا ویسا ہی اظہار سمجھیے۔ جیسے مثلاً سرشار کا خوجی ہے۔

اُردو میں اس نوع کی سوانح نگاری اگر کسی نے کامیابی سے کی ہے، تو فرحت اللہ نے۔ ان کے طویل مضمون "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی" کو دیکھیے، ہمارے پرانے سوانحی مضامین سے کس درجہ مختلف ہے۔ جاڑے کا موسم ہے۔ مولوی صاحب بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور پڑھا رہے ہیں۔ سر پر کنٹوپ ہے مگر بڑا دقیانوسی۔ کبھی کانوں کو ڈھکے ہوئے اور ٹڈریاں نیچے

لٹکتی ہوئی کبھی اس کے دونوں پاکھے اوپر کی طرف سیدھے کھڑے ہو کر لاٹ پادری کی ٹوپی کا نمونہ بن جاتے اور ڈوریاں طرّے کا کام دیتیں، کبھی پاکھوں کو سر پہ اوپر تلے ڈوریوں سے کس دیا جاتا اور اس طرح کنٹوپ فلیٹ کیپ کی شکل اختیار کر لیتا۔ جسم پر روئی کی مرزئی مگر ایسی پرانی کہ اس کی روئی کی گرمی مدت سے مائل بہ سردی ہو چکی ہے۔ اوپر صندلی رنگ کا دُھتسہ پڑا ہوا۔ یعنی دیکھا آپ نے ہمارے مولوی صاحب کو؟ چار بجے اور مولوی صاحب نے آواز دی۔ پانی تیار ہے؟ جواب ملا۔ جی ہاں۔ مولوی صاحب غسل خانہ میں گئے۔ کپڑے بدل یا یوں کہو کہ جون بدل باہر نکل آئے اور چلے ٹاؤن ہال کو۔ لیجیے اب یہ ہمارے مولوی صاحب نہیں رہے۔ آپ کے مولوی صاحب ہو گئے۔

جدید سوانح نگاری ادب کی خاصی ٹیڑھی صنف ہے۔ ایک پہلو سے دیکھیے تو اس میں ناول کی ڈرامت موجود ہے، آخر اس کا موضوع تو ایک انسانی زندگی کا ڈراما ہی ہوتا ہے۔ یہ موقوف ہے مصنف پر کہ وہ اسے کس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ پھر ناول کی مانند جدید سوانح نگاری میں تصویر کشی بھی ہوتی ہے۔ اس کے مصنف کو کوشش کرنی ہوتی ہے کہ اپنے ڈراما کو ہمارے ذہن کی نگاہوں کے سامنے لے آئے، ہمیں اس کے کرداروں کے چہرے نظر آجائیں ہم ان مناظر کو دیکھ سکیں جن میں وہ کردار رہتے سہتے تھے۔ اپنی اس خصوصیت کے اعتبار سے سوانح نگار کا کام ناول نویس کے کام سے بہت زیادہ پیچیدہ بن جاتا ہے۔ اسے سنانی ہوتی ہے ایک سچی کہانی۔ چنانچہ ہر جگہ اصلیت کے ساتھ ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ اسے اپنے واقعات اور کردار بنے بنائے ملتے ہیں۔ چنانچہ مجبور ہوتا ہے کہ انھیں حتی الامکان پوری صحت سے بیان کرے اور خیال رکھے کہ وہ اسی ترتیب اور اہمیت سے پیش کیے جائیں جو فی الواقع اسے حاصل تھی۔ چنانچہ اس کی تخلیقی تحریک مجبور ہوتی ہے کہ ناولسٹ کی تخلیقی تحریک سے مختلف طور پہ اپنا اظہار کرے۔ ناولسٹ کی تخلیقی تحریک اپنے آپ کو زیادہ تر ایجاد میں ظاہر کرتی ہے۔ یعنی مناظر اور کردار کی تخلیق کرنے کی قدرت میں سوانح نگاری کی تخلیقی تحریک ظاہر ہوتی ہے تعبیر میں، اس بات کی صلاحیت میں کہ جو مواد اسے ملا ہے۔ اس کا مفہوم دریافت کرے۔ اس کے سامنے خطوط کا، روزنامچوں کا، سنے سنائے واقعات کا جو انبار لگا

ہوتا ہے، اس مواد میں سے ایسا مسلسل موضوع تلاش کرے جو اس ساری معلومات کو ایک فنی کارنامے کی صورت بخش سکے۔ بچی کاری کے ذریعے تصویریں بنانے والوں کی طرح اس کا کام مختلف ٹکڑوں کو گویا مناسب ترتیب دینا ہوتا ہے۔ وہ ٹکڑوں کی وضع نہیں بدل سکتا۔ اس کا کام ایسا نقشہ ایجاد کرنا ہے جس میں واقعات کے ننھے ننھے ٹکڑے حسن و خوبی سے بیٹھ جائیں۔ مزید برآں اس کے خیال کا کمال اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے مواد میں روح پھونکے۔ واقعات کی سوکھی ہڈیوں کو زندگی کے گوشت پوست کا ایسا چولا پہنائے کہ شخصیت جیتی جاگتی معلوم ہونے لگے۔

تو گویا سوانح نگاری کو حقیقت کے ہم رکاب رہنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں سمجھنے چاہئیں کہ اس طرح اس میں تنوع کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کی ایسی دو سوانح عمریاں تیار ہوں جو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوں مگر دونوں قابل قدر ہوں۔ اس کا تعلق تو اس بات سے ہے کہ واقعات کو دیکھا کس نقطۂ نظر سے جاتا ہے۔ ہر نقطۂ نظر سے وہ مختلف صورتیں اختیار کرلیں گے۔ انھیں جذباتی شخص لکھنے بیٹھے گا تو وہ مؤثر بن جائیں گی، ظرافت نگار لکھنے بیٹھے گا تو ان میں شگفتگی پیدا ہو جائے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ جدید سوانح نگار کو تلوار کی دھار پر چلنا ہوتا ہے۔ ایک طرف تو اس پر کچھ تقاضے فن کے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف زندگی کے۔ اس کی تصنیف کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ بحیثیت تصویر کے بھی تسلی بخش ہو۔ اور بحیثیت مشابہت کے بھی۔ مغربی فسانہ نگاروں میں سے بھی بہت کم اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ان میں سے بعض زندگی پر فن کو قربان کر ڈالتے ہیں۔ واقعات بہت زیادہ بیان کرتے ہیں، انھیں خوشگوار طریق پر بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کی تصویر جیتی جاگتی ضرور ہوتی ہے۔ مگر صحیح نہیں ہوتی۔ بعض اہم واقعات حذف کر جاتے ہیں۔ یا زیادہ مؤثر بنانے کے لیے ان کی صحیح تعبیر کو توڑ مروڑ کر غلط بنا ڈالتے ہیں۔ یا جن امور کے متعلق معلومات بہم نہیں پہنچتی، وہاں ایسے ذاتی خیالات سے کام لینا شروع کر دیتے ہیں جو صحیح نہیں ہوتے۔ سچ یہ ہے کہ دونوں تقاضوں میں صحیح توازن قائم رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ مگر کئی ایسے مصنف بھی ہیں جو اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ انگریزی میں لٹن اسٹریچی کی "وکٹوریا" اس کی کامیاب مثال ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس نوع کی سوانح نگاری آخر ہمارے ہی زمانے کے حصے میں کیوں آئی؟ اس سے پہلے اس طرف توجہ کیوں نہ ہو سکی؟ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ موجودہ زمانہ دوسری اصناف ادب کے پھولنے پھلنے کے لیے زیادہ سازگار نہیں رہا۔ ہمارا زمانہ سائنس کا زمانہ ہے آج کی دنیا میں سب سے زیادہ اہم کام سائنس دان سرانجام دے رہا ہے۔ ہر چیز کے مطالعے میں سائنس کی روح نفوذ کیے ہوئے ہے۔ ایسی صورتِ حال تخلیقی فن کار کے لیے زیادہ حوصلہ افزا نہیں۔ علمی انداز ہوتا ہے سرد اور نقادانہ، یہ جو شیلے جذبے اور رنگینیِ تخیل کو، جو مثلاً شاعری کی روح رواں ہے، کھیل کھیلنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑتا۔ اُدھر لکھنے والوں میں آج بھی لکھنے کا شوق اتنا ہی زیادہ ہے جتنا پہلے تھا۔ چنانچہ وہ کیا کریں؟ وہ جب اظہار کی نئی اور زیادہ سازگار صورتوں کا تجسس کرتے ہیں تو انھیں جدید سوانح نگاری نظر آتی ہے۔ اسے روحِ سائنس سے اجنبی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسے شخصی تصور کے اظہار کے کام میں تو لایا جا سکتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ ناگزیر طور پر حقائق کے بیان سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ حقایق کے مطالعے کے لیے علمی اندازِ فکر لازمی ہے کسی انسان کی قائل کر دینے والی تصویر پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ لکھنے والا تفصیلات پیش کرنے میں ویسی ہی محنت سے کام کرے اور تحقیق و تفتیش میں اتنا ہی ماہر ہو، جتنی مہارت ایک مرض کی تشخیص میں ضروری ہوتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے موضوع کا مطالعہ ایک سائنس دان کی سی بے تعصبی سے کیا جائے۔ پرانے سوانح نگار جب کچھ لکھنے بیٹھتے تھے تو یا شدید طور پر اپنے موضوع کے حق میں لکھتے تھے یا مخالفت میں، اور اگر بے تعصب ہوتے بھی تھے تو اُن کے خیالات کو شدید اخلاقی عقائد اس درجہ بدل ڈالتے تھے کہ وہ اپنے موضوع کے افعال و اعمال پر ایک جج کی طرح نظر ڈالنے لگتے تھے۔ لیکن سوانح نگار کا کام وجوہ بیان کرنا ہے، فیصلہ سنانا نہیں ہے۔ کسی شخص کے متعلق واضح تصور قائم کرنے کے لیے بتانا ضروری نہیں کہ اس کے اعمال اچھے تھے یا بُرے۔ ایسی رائے زنی سے تو تصور دھندلا جاتا ہے۔ بتانے کی بات یہ ہوتی ہے کہ اس نے وہ اعمال کیوں کیے اور کس طرح کیے۔ یہ انداز بھی سائنس ہی کا ہے۔ سائنس دان کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ بیماری کوئی بُری چیز ہے، وہ اپنا تعلق صرف اس بات سے رکھتا ہے کہ بیماری کے اسباب کیا ہیں، اور علامات کیا

ہیں۔اس قسم کے غور وفکر کے لیے ہم مقابلہ پرانے زمانہ کے آج کل زیادہ تیار ہیں۔آخری وجہ جو موجودہ زمانے کو سوانح نگاری کے لیے زیادہ سازگار ثابت کرتی ہے یہ ہے کہ پچھلے چالیس سال میں نفسیات کے مطالعہ نے بہت زیادہ ترقی کی ہے۔انسانی شخصیت کی ماہیت کو، اسے تحریک دینے والی قوتوں کو، وراثت اور ماحول کے اثر کو، جیسی وضاحت سے آج سمجھا جا رہا ہے، پہلے کبھی نہ سمجھا گیا تھا۔ چنانچہ انسانی کردار کا بیان جتنا تفصیل و وضاحت سے مصنف آج کر سکتا ہے پہلے کبھی نہ کر سکتا تھا۔

مسلمانوں کے عقائد و افکار

علامہ ابوالحسن اشعری ترجمہ مولانا محمد حنیف ندوی

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری کے جلیل القدر عالم علامہ ابوالحسن اشعری کے شاہکار مقالات الاسلامیین کا ترجمہ ہے۔ اس میں علامہ نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے ان تمام عقائد و افکار کو بغیر کسی تعصب کے بیان کر دیا ہے جو صدیوں ہمارے ہاں فکری و کلامی مناظروں کا محور بنے رہے۔ اس کے مطالعے سے جہاں یہ معلوم ہو گا کہ مسلمانوں نے نفسیات اخلاق اور مادہ و روح کے بارے میں کن کن علمی جواہر پاروں کی تخلیق کی ہے وہاں یہ حقیقت بھی نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ماضی میں فکر و نظر کی کجی نے کن کن گمراہیوں کو جنم دیا ہے اور ان گمراہیوں کے مقابلے میں اسلام نے کس معجزانہ انداز سے اپنے وجود کو برقرار رکھا ہے۔

قیمت : ۹ روپے

ملنے کا پتہ

سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور